© rasailojaraid.com

تقریظ و انتقاد

تعلیمات قرآن

(۲)

نظام عالم کی مدت صفحہ ۶۲ پر یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۳۲ : ۱) اور تعرج الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ (۷۰ : ۱) ۔ کی تفسیر کرتے ہوئے حاشیہ پر لکھتے ہیں۔

> نزولِ امر اور عروجِ امر سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا آغاز و انجام مراد ہے اور جملہ امور کے خاتمہ کی مدت پچاس ہزار سال ہے۔ یعنی نظام عالم کے قیام کی مدت پچاس ہزار سال ہے جس کے بعد قیامت آجائے گی"۔

یہ تفسیر قریب قریب وہی ہے جو ابو مسلم اصفہانی سے منقول ہے؛ لیکن قرآن مجید سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ دونوں آیتوں کے الفاظ میں کوئی خفیف سا اشارہ بھی اس جانب نہیں ہے کہ نظام عالم کی مدت قیام ۵۰ ہزار سال ہے۔ نیز جہاں تک غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، ان دونوں آیتوں میں کوئی ایسا ربط بھی نہیں ہے کہ ان کو ملا کر کوئی نتیجہ اخذ کیا جاسکے۔ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے تدبیر امر کا ذکر فرمایا ہے کہ وہ آسمان سے زمین تک دنیا کا انتظام کرتا ہے اور اس انتظام کا عروج اس کی جانب ایک دن میں ہوتا ہے جو تمہارے حساب سے ہزار سال کے برابر ہے۔ اس تدبیر امر کی کیفیت، اور ایک ایسے طویل دن میں اسکا عروج ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اگر اس کی تفصیل ہمارے سامنے بیان کی بھی جاتی تو ہم اس کو نہ سمجھ سکتے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

البتہ یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو کچھ فرمایا گیا ہے موجودہ نظام عالم کی تدبیر کے باب میں ہے بخلاف اس کے دوسری آیت میں جس دن کا ذکر ہے وہ اِس نظام کے خاتمہ کا دِن یعنی قیامت ہے۔ چنانچہ پوری آیت کے الفاظ ملاحظہ ہوں

سَاَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ لِّلْکٰفِرِیْنَ لَیْسَ لَهٗ دَافِعٌ مِّنَ اللّٰهِ ذِی الْمَعَارِجِ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِکَةُ وَالرُّوْحُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِیْلًا اِنَّهُمْ یَرَوْنَهٗ بَعِیْدًا وَّنَرٰىهُ قَرِیْبًا یَوْمَ تَکُوْنُ السَّمَآءُ کَالْمُهْلِ وَتَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِهْنِ الخ

پوچھنے والے نے پوچھا اس عذاب کے بارے میں جو کافروں کے لئے واقع ہونے والا ہے۔ اس کو تو کوئی دفع کرنے والا نہیں، وہ بلند مراتب والے خدا کی طرف سے ہے۔ ملائکہ اور روح اس کی طرف چڑھیں گے ایک ایسے دن میں جس کی مقدار ۵۰ ہزار برس ہوگی پس اے محمد تو ان کی باتوں پر اچھی طرح صبر کر۔ یہ اس دن کو دور دیکھ رہے ہیں اور ہم قریب دیکھتے ہیں۔ وہ ایسا دن ہوگا کہ آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا۔ اور پہاڑ رنگ برنگ کے اون کی طرح اڑتے پھریں گے۔

اس آیت کی تفسیر میں تمام بڑے بڑے مفسرین مثل عکرمہ و قتادہ و ضحاک و ابن زید و ابن عباس سے بھی یہی منقول ہے کہ اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے اور وہ دن کافروں کے لئے ایسا طویل ہوگا جیسے ۵۰ ہزار برس۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ سے عرض کیا گیا کہ یہ تو بڑا ہی لمبا دن ہوگا! حضور نے فرمایا کہ "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، مومن پر وہ اتنا خفیف ہو جائیگا جتنا دنیا میں ایک فرض نماز پڑھنے کا وقت ہوتا ہے"!

اسلام اور ایمان کا فرق صفحہ ۴۰ پر قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ (۴۹ : ۲)۔ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"اسلام اور ایمان میں ظہور اور بطون کا فرق ہے۔ اللہ نے ظہور کی بنیاد پر ہمارا نام مُسلم رکھا ہے جس کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے بخلاف اس کے جو لوگ اپنے آپ کو مومن کہتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں۔ وہ لبطون یعنی ایمان کے جو ہی ہیں جس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں اس لئے یہ نام تزکیۂ نفس کا ادعا ہے جس سے ممانعت کی گئی ہے۔

اس تفسیر سے دو غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ "اسلام" ایمان کے بغیر بھی متحقق ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی مسلمان کا اپنے آپ کو مومن کہنا خلاف حکم قرآن ہے۔ یہ دونوں باتیں آیت مذکورہ کے معنی اور سیاق و سباق پر غور نہ کرنے کا نتیجہ ہیں۔ وہاں دراصل "اسلام" اپنے اصطلاحی معنوں میں نہیں بلکہ لغوی معنوں میں آیا ہے۔ اس کے مخاطب اہل بادیہ (یعنی اعراب) ہیں جو پوری طرح اسلام کو نہیں سمجھتے تھے، اور صرف اس سیاسی تعلق سے مرعوب ہو کر مطیع ہو گئے تھے۔ ان سے فرمایا گیا ہے کہ "تم اپنے آپ کو مومن نہیں کہہ سکتے۔ صرف مسلم (مطیع) کہہ سکتے ہو کیونکہ ابھی تک تمہارے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا ہے۔ تم لوگ اگر اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی اطاعت کرو گے تو اس کا اجر تم کو حق کے مطابق ضرور ملے گا۔ مگر سچے مومن تو دراصل وہی ہیں جن کے دل میں اللہ کی یکتائی اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر پورا پورا یقین موجود ہے، کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہے اور جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں۔" ان الفاظ سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں جس اسلام کا ذکر ہے وہ محض اس اطاعت کے معنی میں ہے جو ایمان کے بغیر حاصل ہو گئی ہے لیکن عام طور پر قرآن مجید نے "اسلام" کی اصطلاح جس معنے میں استعمال کی ہے۔ وہ ایمان اور اطاعت دونوں کو شامل ہے۔ "اسلام" کی حقیقت، ایمان کے بغیر متحقق ہی نہیں ہوتی، اور وہ "مسلم" ہی نہیں کہا جا سکتا جو مومن نہ ہو۔ کیونکہ "اسلام" خدا کا "دین" ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (۳:۲) اور خدا کا دین جوارح سے پہلے قلب کی اطاعت چاہتا ہے۔ بس اس معنی میں جو شخص "مسلم" ہے وہ سب سے پہلے "مومن" ہے اور اس کو ایمان کا دعوی کرنے سے ہرگز منع نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ اس دعوی کی صریح اجازت موجود ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ وَاللّٰہُ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اِنَّنَا اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ الصَّابِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقَانِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ (۳:۲)۔ رہا وہ استدلال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو جناب مولف نے فَلَاتُزَکُّوْا اَنْفُسَکُمْ سے کیا ہے تو وہ کسی طرح درست نہیں، کیونکہ یہ ارشاد جس موقع پر ہوا ہے وہاں تو یہ بتایا گیا ہے کہ حق تعالیٰ جس نے تم کو پیدا کیا ہے، تمہاری کمزوریوں سے خوب واقف ہے۔ اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرو تو تمہارا رب جو "واسع المغفرت" ہے تمہارے چھوٹے چھوٹے گناہوں کو بخش دیگا۔ لہٰذا تم اپنے نفس کی پاکیزگی نہ جتاؤ۔ خدا خوب جانتا ہے کہ کون کتنا متقی ہے (ملاحظہ ہو سورہ نجم رکوع دوم)۔

عقیدۂ تقدیر صفحہ ۵۷ پر اجزاء ایمان بیان کرتے ہوئے حاشیہ پر فرماتے ہیں کہ:۔

"قرآن میں ایمان کے صرف یہی پانچ اجزاء ثابت ہوتے ہیں۔ تقدیر قرآنی مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے عقائد میں داخل نہیں"

یہ عبارت اس قدر مبہم ہے کہ پوری طرح مؤلف کا مطلب ظاہر نہیں ہوتا ہم نہیں کہہ سکتے کہ "قرآنی مسائل" سے مولف کی مراد کیا ہے؟ اور تقدیر کے مسئلہ کو عقائد سے خارج کرنے کا کیا مطلب ہے؟ تاہم اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جناب مولف کی رائے میں عقیدۂ تقدیر جزء ایمان نہیں ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہم کہیں گے کہ جناب مولف نے اس مسئلہ کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ عقیدۂ تقدیر منجملہ ان عقاید کے ہے جو ایمان باللہ کے اجزاء ہیں۔ جس طرح خدا کے سمیع، بصیر، علیم، خالق اور رزاق وغیرہ ہونے پر اعتقاد رکھنا جزء ایمان ہے، اسی طرح یہ اعتقاد بھی جزء ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے امر اور اس کی قضاء اور مشیت کے خلاف کسی شے اور کسی فعل کا صدور نہیں ہوسکتا اور نہ اگر صفات الٰہی میں سے ہر ہر صفت کے بیان کو قرآنی مسائل میں سے ایک مسئلہ کہہ کر عقائد سے خارج کردیا جائے تو پھر ایمان باللہ کس چیز کا نام رہ جائیگا؟ ایمان باللہ تو انہی تفصیلات کے مجموعہ کا نام ہے جو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور افعال کے متعلق بیان کی گئی ہیں۔ ان سے قطع نظر کرکے صرف خدا کے وجود اور اس کی یکتائی پر ایمان لانا ہرگز کافی نہیں ہے۔

علماء وصلحاء کا اتباع صفحہ ۸۳ پر تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"شرک کی ایک صورت یہی ہے کہ علماء اور صلحاء کو امام اور ہادی مان کر ان کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اقوال کو اللہ کے قول کی طرح بلا سند تسلیم کرنا"۔

اس پر حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ

"ائمہ سلف اور بزرگان دین کے علوم اور حالات سے علمی اور تاریخی فائدہ حاصل کئے جاسکتے ہیں لیکن ان کے کسی قول کو بلا قرآنی سند کے دین ماننا شرک ہے"۔

پھر صفحہ ۱۰۲ پر لکھتے ہیں کہ "کتاب اللہ کو چھوڑ کر بزرگوں کی پیروی کرنا گمراہی ہے" اور صفحہ ۱۵۲ پر تحریر فرماتے ہیں کہ "رسول اور امیر کی اطاعت کے سوا اور کسی کی اطاعت کا حکم قرآن میں نہیں ہے بلکہ ممانعت ہے"۔ اور صفحہ ۴۵ پر فرماتے ہیں "بلکہ عام طور پر انسانوں کی اطاعت کو قرآن خطرناک قرار دیتا ہے"۔

یہ سب کچھ تشدد پر مبنی ہے مسلمانوں میں جاہل پیروں اور نفس پرست علماء سو کی اندھی تقلید اور جاہلانہ اطاعت کے جو آثار نظر آتے ہیں ان پر جتنا بھی اظہار غضب کیا جائے، جائز اور بجا ہے لیکن افسوس ہے کہ مؤلف نے شدت غیظ میں علماء حق اور صلحاء امت اور ائمہ ھداۃ کی اطاعت اور پیروی کو بھی گمراہی قرار دے دیا ہے، اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس کو شرک تک کہدیا حالانکہ اگر وہ انہی آیات قرآنی پر غور فرماتے جن کو انہوں نے استدلال میں پیش کیا ہے، تو انہیں خود احساس ہوجاتا کہ وہ حق سے بہت کچھ تجاوز کر گئے ہیں شرک جس چیز کا نام ہے وہ تو بغیر اس کے متحقق نہیں ہوسکتی کہ کوئی شخص خدا کے سوا کسی دوسرے کو حقیقی معنوں میں آمر اور ناہی قرار دے، یا خدا کے امر و نہی کے مقابلہ میں یا اس کے برابر کسی اور کے امر و نہی کو واجب الاطاعت سمجھے۔ لیکن یہ مخفی نہیں ہے اور غالباً جناب مؤلف خود بھی جانتے ہونگے کہ کوئی جاہل سے جاہل مسلمان بھی ایسا اعتقاد نہیں رکھتا۔ لہٰذا اس معاملہ میں شرک کا تو شائبہ بھی نہیں ہے۔ جو شخص کسی کے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا کا مقرب ہے اور اس کی شریعت اور اس کے احکام کو دوسروں کی بہ نسبت زیادہ بہتر جانتا ہے وہ اگر اس کی پیروی یہ سمجھ کر کرے کہ اس کی پیروی 'رضائے الٰہی کی پیروی ہے' تو اس پر شرک کا فتوی لگانا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صریح ظلم ہوگا۔ اب رہ گیا یہ سوال کہ کس کا اتباع کرنا جائز ہے، اور کس کا اتباع گمراہی ہے۔ تو قرآن مجید صاف کہتا ہے کہ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ (۱:۲۳) وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (۱۸:۴) فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ (۱:۲۸) وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا (۲:۷۶) یعنی کافروں اور منافقوں اور خدا کو بھول جانے والوں اور ہوائے نفس کی پیروی کرنے والوں، اور افراط پسندوں، حق کو جھٹلانے والوں اور گناہ گار ناشکروں کی پیروی نہ کرو۔ یہ کہیں بھی نہیں کہا گیا ہے کہ صالحین اور اہل علم کی پیروی نہ کرو۔ بلکہ قرآن تو کہتا ہے کہ فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۶:۱۶) اور اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (۱:۶) یعنے اگر تم نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پوچھو، اور جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے ان کے راستے کی پیروی کرو۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، مولف نے صحیح اور غلط کو خلط ملط کر دیا ہے، اور اسی افراط پسندی کی رو میں بہ گئے ہیں جو آج کل کے تجدد پسند حضرات میں پائی جاتی ہے۔ علماء اور صلحاء کرام کو ہادی ماننا کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ غیر عالم اور غیر صالح کے لئے ان کی امامت وہدایت کو قبول کرنا لازم ہے البتہ ان کے قول کو اللہ کے قول کی طرح سمجھنا ضرور گناہ ہے۔ اسی طرح یہ درست ہے کہ کتاب اللہ کو چھوڑ کر بزرگوں کی پیروی کرنا گمراہی ہے لیکن جو شخص یہ سمجھ کر بزرگوں کی پیروی کرے کہ وہ خود کتاب اللہ کا علم نہیں رکھتا اور بزرگان سلف نے جو طریقے اختیار کیے ہیں وہ کتاب اللہ کے مطابق ہیں، تو اس کو کسی طرح گمراہ نہیں کہا جا سکتا زیادہ سے زیادہ آپ جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ صرف اس قدر ہے کہ اس نے پیروی کے لئے جن بزرگوں کو چن لیا ہے ان کا انتخاب درست نہیں ہے۔ آپ تقلید جامد اور اندھی پیروی کی جتنی چاہیں برائی کر سکتے ہیں، سب بجا اور درست آپ یہ کہنے کا حق بھی رکھتے ہیں کہ ولایت، امامت، اجتہاد اور علم وفضیلت بزرگوں پر ختم نہیں ہوگئیں آج بھی یہ سب مرتبے حاصل ہو سکتے ہیں، اور ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے لیکن تقلید کی مخالفت اور اجتہاد کا شوق اگر اس حد تک پہنچ جائے کہ بزرگان سلف کے خلاف ایک ضد سی پیدا ہو جائے، اور ان کی بنائی ہوئی عمارتوں کو خواہ مخواہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈھا دینا ہی ضروری سمجھ لیا جائے، اور محض نئی بات پیدا کرنے کی خاطر جدت طرازیاں کی جائیں، اور لوگ اہلیت کے بغیر امامت اور اجتہاد کے منصب پر متمکن ہونے کی کوشش کریں، اور کتاب اللہ و سنت رسول کو بازیچۂ اطفال بنائیں تو یہ گمراہی پہلی گمراہی سے بھی زیادہ سخت ہوگی۔ اور اس ذہنیت کے ساتھ جس قوم کی تعمیر کی جائے گی اس کی تعمیر عین تخریب ہوگی۔ مقلدین تو صرف اتنا کرتے ہیں کہ جو دیواریں ان کے اسلاف اٹھا گئے ہیں ان کو بجنسہ رہنے دیتے ہیں اور ان پر کوئی اضافہ نہیں کرتے لیکن تجدد پسند حضرات ضروری سمجھتے ہیں کہ پچھلی دیواروں کو ڈھا کر خود نئی دیواریں اٹھائیں۔ اور اس ذہنیت کا مقتضی یہی ہے کہ ہر نئے دور والے پچھلے دور والوں کی اٹھائی ہوئی دیواروں کو ڈھا کر نئی دیواریں اٹھایا کریں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی عمارت بننے ہی نہ پائے گی اور ہدم و تعمیر کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری رہے گا۔

علم غیب رُسل صفحہ ۱۲۶ پر لکھا ہے۔

"رسول کو عالم غیب سے وہی باتیں بتائی جاتی ہیں جن کو اللہ ان کے توسط سے اپنے بندوں کے پاس بھیجنا چاہتا ہے۔"

استدلال میں یہ آیت پیش کی ہے۔

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ (۷۲: ۲)۔	وہ غیب کا عالم ہے، اور وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا البتہ جس رسول کو پسند کرتا ہے اسے غیب سے باخبر کر دیتا ہے تاکہ اس کو معلوم ہو جائے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغام پہونچا دیے۔

مگر یہ آیت اُس مفہوم کی تصریح نہیں کرتی جو مؤلف نے اس سے اخذ کیا ہے۔ آیت کے آخری ٹکڑے کا مفہوم مختلف فیہ ہے۔ بعض کے نزدیک لِيَعْلَمَ کا فاعل خدا ہے اور بعض کے نزدیک رسول۔ اسی طرح قَدْ اَبْلَغُوْا کے متعلق بھی اختلاف ہے کہ اس سے مراد آیا وہ فرشتے ہیں جو خدا کے پیغامات رسول کے پاس لاتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یا خدا کے پیغمبر ہیں۔ تاہم اگر اس فقرہ کا یہ ترجمہ بھی کیا جائے کہ خدا اپنے رسول کے آگے اور پیچھے نگہبان مقرر کر دیتا ہے تاکہ خدا کو معلوم ہو جائے کہ رسول نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے"۔ تب بھی اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ رسولوں کو عالم غیب کی صرف وہی باتیں بتائی جاتی ہیں جو اللہ تعالیٰ ان کے واسطے سے اپنے بندوں کو بتانا چاہتا ہے۔ کیونکہ اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ غیب کے متعلق عام بندوں کا علم رسولوں کے علم کے برابر ہے، اور رسولوں کو اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا گیا جو بندوں کو بتایا گیا ہے۔ حالانکہ خود قرآن مجید میں حضرت یعقوب کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ آپ نے اپنے بیٹوں سے فرمایا اِنِّیٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۱۲: ۱۱) میں خدا کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ علاوہ بریں قرآن مجید کے بکثرت مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ قوموں پر عذاب بھیجنے سے پہلے ان کے نبیوں کو خبریں دیدی گئیں اور انہوں نے عذاب کے وقت اور اس کی تفصیلی کیفیت سے اپنی قوم کو مطلع نہ کیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کو تو اتنے پہلے عذاب کی خبر دیدی گئی تھی کہ انہوں نے طوفان آنے سے پہلے کشتی بنا لی۔ خود نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کے ایسے ایسے حالات بتائے گئے تھے جو آپ کی امت کو نہیں بتائے گئے، چنانچہ ایک مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے حضور نے ارشاد فرمایا کہ یا امۃ محمد واللہ لَوْ تَعْلَمُوْنَ ما اعلم لضحکتم قلیلاً ولبکیتم کثیراً۔ (بخاری۔ باب الصدقۃ فی الکسوف)۔ اے محمد کی قوم! خدا کی قسم اگر تم کو وہ باتیں معلوم ہوتیں جو میں جانتا ہوں، تو تم کم ہنستے اور بہت روتے ایک اور موقع پر حضور نے فرمایا کہ۔ اِنی لاراکم من ورائی کما اراکم (بخاری باب عظمۃ امام الناس) میں تم کو پیچھے سے بھی ایسا ہی دیکھتا ہوں جیسا سامنے سے دیکھتا ہوں غرض بکثرت آیات اور روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ رسولوں کو جو علم غیب دیا گیا تھا وہ اس سے بہت زیادہ تھا جو ان کے واسطے سے بندوں تک پہنچا اور عقل بھی یہی چاہتی ہے کہ ایسا ہو۔ کیونکہ بندوں کو تو غیب کی صرف وہی باتیں معلوم ہونے کی ضرورت ہے جن کا تعلق عقائد ایمانیہ سے ہے لیکن رسولوں کو ان کے سوا اور بہت سی ایسی معلومات بھی حاصل ہونی چاہئیں جو فرائض رسالت انجام دینے میں ان کے لئے مددگار ہوں جس طرح سلطنت کی پالیسی اور اس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسرار سے وائسرائے اور گورنروں کا ایک خاص حد تک واقف ہونا ضروری ہے اور عام رعایا تک ان رازوں کا پہنچ جانا بجائے مفید ہونے کے الٹا مضر ہوتا ہے، اسی طرح ملکوت الٰہی کے بھی بہت سے اسرار ہیں جو خدا کے خاص نمایندے اور اس کے خلفاء جانتے ہیں اور عام رعیت ان سے بے خبر ہے۔ یہ علم غیب ان خلفاء کو تو اپنے فرائض انجام دینے میں مدد دیتا ہے لیکن عام رعایا کے لئے اس علم کی نہ ضرورت ہے اور نہ وہ اس کی متحمل ہو سکتی ہے۔

متفرق مسائل مذکورہ بالا امور کے علاوہ کتاب میں چند چھوٹی چھوٹی لغزشیں بھی ہیں۔ چونکہ اس تنقید کا مقصد خوردہ گیری نہیں ہے اس لئے ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے لیکن ان میں سے بعض کی طرف فاضل مولف کی توجہ منعطف کرانا ضروری ہے۔ مثلاً

متعدد مقامات پر استوا علی العرش کا ترجمہ عرش پر بیٹھنا کیا گیا ہے۔ یہ درست نہیں ہے! اول تو حق تعالیٰ کے لئے "بیٹھنے" کا لفظ استعمال کرنے میں تشبیہ و تجسیم کا اندیشہ ہے۔ دوسرے خود لغت کی رو سے بھی لفظ استوا جلوس کا ہم معنی نہیں۔ جب استوا کے لئے علیٰ کا صلہ آتا ہے تو اس کے معنی استیلا یعنی چھا جانے اور غالب ہو جانے کے ہوتے ہیں۔ پس اگر عرش سے کوئی مادی تخت نہیں بلکہ زمین و آسمان اور کل جہان کی حکومت مراد لی جائے تو اس پر مستوی ہونے کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ تمام عالم کی فرمانبروائی پر چھایا ہوا ہے۔

صفحہ ۲۷ پر سات آسمانوں اور سات زمینوں کا حساب سمجھانے کی کوشش کی ہے اس میں شک نہیں کہ بات لگتی ہوئی ہے اور جس طریقے سے انھوں نے سمجھایا ہے اس سے وہ اعتراضات رفع ہو جاتے ہیں جو نئے زمانے کے اہل ہیئت کی طرف سے کئے جاتے ہیں لیکن ہمارا خیال ہے کہ قرآن مجید کے ایسے بیانات کو کسی عہد کے علوم و نظریات سے مطابق کرنے کی سعی کرنا اصولاً صحیح نہیں ہے زیادہ بہتر یہی ہے کہ ان مسائل میں سکوت اختیار کیا جائے اور ایسی آیتوں کے معنی و مفہوم کو دلالت لفظی سے تجاوز کر کے قیاس و تاویل کے ساتھ متعین کرنے کا طریقہ قطعاً ترک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر دیا جائے۔ اسی طرح آسمانوں کے طبق بر طبق ہونے اور ان کے محفوظ ہونے کو ہیئت کی جدید معلومات کے لحاظ سے سمجھانے کی جو کوشش صفحہ ۲۰۰ پر کی گئی ہے اور واللہ اَنۡبَتَکُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ نَبَاتًا اور وَقَدۡ خَلَقَکُمۡ اَطۡوَارًا سے نظریۂ ارتقا کی طرف جو اشارہ کیا گیا ہے اس سے بھی احتراز واجب تھا۔ پرانے زمانے کے علماء یہ غلطی کر چکے ہیں کہ قرآن مجید کو انھوں نے قدیم فلسفہ اور ہیئت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی اور اس زمانے کے بندگان عقل کو مطمئن کرنے کے لئے قرآن کو ارسطو اور افلاطون اور بطلیموس کے نظریات پر منطبق کر ڈالا لیکن موجودہ دور کے نظری اور تجربی علوم نے جب پچھلے نظریات کو باطل کر دیا تو وہ تمام تاویلیں جو پہلے کی گئی تھیں غلط ثابت ہوئیں، اور وہ تمام سہارے ٹوٹ گئے جن پر قرآن مجید کی تاویل کا مدار رکھا گیا تھا پھر سید احمد خانی دور میں دوبارہ اسی غلطی کا اعادہ کیا گیا۔ مگر سائنس کی جدید ترقیات نے ان سہاروں میں سے بھی بہتوں کو توڑ دیا جن پر سید مرحوم اور ان کے متبعین نے تاویل کی عمارت قائم کی تھی۔

ان تجربات سے ہم کو سبق لینا چاہئے اور یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ قرآن کے لئے انسانی علوم کے سہاروں کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں۔ اس کتاب میں تو فاطر السموٰت والارض کا علم ہے جو ظن اور تخمین نہیں بلکہ علم حق اور عین حق ہے یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ اس کی کوئی بات غلط ہو ہاں یہ ممکن ہے کہ اس کی بعض باتیں ہمارے اس وقت کے علوم (یا بصحیح معنوں میں ظنون) اور نظریات کے خلاف ہوں، لیکن اس کی کسی بات کا ان کے خلاف ہونا اس کے غلط ہونے کی دلیل نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ کل جب علم کی مزید روشنی ہم کو حاصل ہو تو خود ہمارا یہ نظریہ ہی بدل جائے، ہم پر کچھ مزید حقائق منکشف ہوں اور اس وقت ہم کو اس بات کے صحیح معنے معلوم ہو جائیں جو قرآن میں ارشاد ہوئی ہے۔

اب چند اہم مسائل باقی رہ گئے ہیں جن میں ہم کو فاضل مؤلف سے شدید اختلاف ہے۔ ان پر انشاء اللہ آئندہ صحبت میں گفتگو کی جائے گی۔ (باقی آئندہ)

© rasailojaraid.com